بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان کا نظریاتی وجود اور عملی تقاضے

پروفیسر خورشید احمد

بیسویں صدی کی عالمی تاریخ میں پاکستان کا قیام، ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ ایک نیا ملک دُنیا کے جغرافیائی نقشے پر نمودار ہوا تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ یہ نیا ملک نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوا تھا اور اس کا وجود مغرب کی قوم پرستانہ فکر کے لیے ایک چیلنج تھا۔ اس ملک نے نظریاتی سیاست کا علَم بلند کیا تھا اور تنگ نظر قوم پرستی (Narrow Nationalism) کی ستم زدہ دُنیا کے سامنے ایک نئی راہ پیش کی تھی۔

تحریکِ پاکستان کی اصل بنیاد یہ تھی کہ:

چونکہ مسلمان اپنے مذہب اور عقیدے کی وجہ سے ایک قوم اور ایک ملّت ہیں۔

اور ——

چونکہ مسلمان اپنی آئیڈیالوجی، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنا نظامِ قانون رکھتے ہیں، جسے وہ اجتماعی زندگی میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس لیے جن علاقوں میں ان کی اکثریت ہے، ان پر مشتمل ایک ریاست قائم کی جائے، تاکہ وہ اپنی جداگانہ قومیت کی بنیاد پر اپنی تہذیب اور اپنی آئیڈیالوجی کو قائم کرسکیں۔

یہ وہ انقلابی اعلان تھا، جس نے ایک طرف مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور دوسری طرف دُنیا کے تمام باطل تصورات کو چیلنج کیا۔ مسلمانوں نے بہت بڑی قربانی دے کر سات سال تک اَن تھک جدوجہد کی، جس کے نتیجے میں ان کی اپنی الگ ریاست اُبھری۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عام مسلمانوں کو اسلام کے علاوہ کسی اور مقصد نے کبھی اپیل ہی نہیں کیا۔ ظالم بادشاہ بہت سے ہوئے، اسلام سے انحراف کرنے والے بھی بیسیوں گزرے، لیکن اُمت نے

کبھی انھیں اپنی آنکھوں کا تارا نہ بنایا۔ کبھی ان کو تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ ان میں سے بہتوں کے طرزِ حکمرانی کی بنا پر اکثر لعنت ہی بھیجی۔ اس اُمت نے بہت مظالم برداشت کیے، بڑی مشقتیں جھیلیں، بے پناہ مصائب کو انگیز کیا، مگر اسلام کے علاوہ کسی اور مقصد کی خاطر دل و جان سے قربانی کے لیے کبھی تیار نہ ہوئی۔

ہمیشہ اس کے ہیرو، امام ابوحنیفہؒ، امام جعفر صادقؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالک بن انسؒ، امام شافعیؒ، ابن تیمیہؒ، صلاح الدین ایوبیؒ، مجدد الف ثانیؒ اور سیّد احمد شہیدؒ وغیرہم ہی رہے۔ کسی حسن بن صباح اور اکبر کو اس اُمت نے اپنا ہیرو اور آئیڈیل نہیں بنایا، اور اسلام کے علاوہ کوئی اور نصب العین اس کی وفاداریوں کا مرکز نہ بن سکا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا اپنے اور پرائے سبھی اعتراف کرتے ہیں، حتیٰ کہ بیسویں صدی کے ممتاز مستشرق ولفریڈ کینٹ ول اسمتھ (۱۹۱۶ء-۲۰۰۰ء) نے اپنی تصنیف Islam in Modern History [دورِ جدید میں اسلام: ۱۹۵۷ء] میں لکھا ہے:

''ماضی میں صرف اسلام ہی ان لوگوں (یعنی مسلمانوں) کا اجتماعی ضابطہ، اصل محرک اور کارفرما قوت رہا ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کے کسی گروہ نے بھی اپنے میں ایسے قومی اور وطنی جذبات پیدا نہیں کیے، جس کی وفاداری اور تعلق کا مرکز اسلام سے ہٹ کر کوئی اور شے یا مسلم ملّت کے دائرے سے باہر کی کوئی چیز ہو''۔

بلاشبہہ یہ مسلمانوں کی قابلِ فخر قومی اور ملّی خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظریۂ پاکستان نے مسلمانوں کو اسی بنیاد پر اپیل کیا تھا کہ یہ ان کی روح کی آواز، ان کے ایمان کی پکار، اور ان کی ملّی تمناؤں کا آئینہ دار تھا۔ اور پاکستان کے مستقبل کی تعمیر میں بھی مسلمانوں کا حقیقی تعاون اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب وہ دیکھیں کہ یہ اسلامی نظریے کے لیے وقف ہے۔ کوئی اور محرک ایسا نہیں ہوسکتا، جو ملّت اسلامیہ پاکستان کو کسی عظیم کارنامے کی انجام دہی کے لیے تیار کرسکے۔ یہ صلاحیت اسلام اور صرف اسلام میں ہے۔

اسلامی نظریے کی ضرورت و اہمیت

اسلامی نظریے کی بنیاد پر سیاست اور ریاست کے معاملات چلانے، اور تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے کی ضرورت محض اس لیے ہی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں اس کے بغیر جذبۂ عمل و قربانی

پیدا نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس لیے بھی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کی ایک خاص انداز میں تربیت کی ہے۔ اس نے لوگوں کے ذہنوں سے دین و دُنیا اور مذہب و سیاست کی تفریق کے باطل نظریات کو کھرچ کھرچ کر نکال دیا ہے، اور ان کو یہ تعلیم دی ہے کہ دین کو زندگی کے ہر شعبے پر غالب کریں۔

اس پس منظر کی وجہ سے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک معاملے میں دین کا تقاضا کچھ اور ہے اور مروجہ نظام کا اندازِ کار کچھ اور، تو وہ اس تناقض (contradiction) کو نظرانداز نہیں کر سکتے ___ ایک عیسائی کے لیے غالباً یہ ممکن ہے کہ وہ اس تناقض کو برداشت کرلے۔ ایک ہندو کے لیے شاید آسان ہو کہ وہ اس سے صرفِ نظر کرلے کہ ان کے مذاہب نے اجتماعی زندگی میں دین کو قائم کرنے کی کوئی روایت پیش نہیں کی ہے۔ لیکن اسلام کی روایت ان مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس تناقض کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عظیم میں فرمایا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (المائدہ ۵:۴۴) اور جو خدا کے نازل کردہ قانونِ حیات کے مطابق اپنے فیصلے نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں جتنی اجتماعی بے اطمینانی پیدا ہوئی ہے، اور انقلابی تحریکات اُٹھی ہیں، ان سب کا جذبۂ محرکہ اسی تناقض اور تضاد کو دُور کرنا تھا۔

اگر اس نظریے کو نظرانداز کیا گیا، تو اس سے ایک طرف ملّت میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگی، دوسری طرف مروجہ نظام سے مایوسی ___ اور یہ دونوں چیزیں ایک قوم کے لیے بہت مہلک ہیں۔ اپنی قومی صحت کی درستی اور اجتماعی زندگی کے سکون کو قائم رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد اسلامی نظریے کی بنیاد پر اپنی ریاست کو تعمیر کریں تاکہ قوم کی تمام قوتیں، تعمیرِ نو کے لیے استعمال ہوں اور کوئی اندرونی کش مکش رُونما نہ ہو۔

پھر خود ملک جن مشکلات اور جن معاشی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی بیماریوں کا شکار ہے، ان کا حل بھی صرف اسلامی نظریے میں مضمر ہے۔ مغرب کی ہوش ربا ٹکنالوجیکل ترقی اور بے پناہ مادی تجربات کی سلسلہ وار روایت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ محض مادی ترقی سے انسان کے مسائل حل نہیں ہوتے۔

اسی طرح تیل پیدا کرنے اور اس بے اندازہ دولت کو گاڑیوں، عمارتوں کی تعمیر، بنکوں میں تجوریاں بھرنے یا لہوولعب میں اُڑانے والے بعض مسلم ممالک کے تجربات نے بھی یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں کردی ہے کہ مسلمان دین کے مقتضیات کو چھوڑ کر محض مادی ترقی بھی نہیں کرسکتے۔ ہمارے مصائب کا حل اسلامی نظامِ حیات میں ہے، جو: ایک طرف فرد میں تقویٰ، ایمان اور خدا کا خوف پیدا کرتا ہے، اور دوسری طرف معاشرے کو صحت مند بنیادوں پر قائم کرتا ہے۔ تیسری جانب سیاست کو اخلاق کے تابع کرتا ہے۔ چوتھی طرف معیشت کو عادلانہ معاشی انصاف کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔ اور پانچویں جانب قومی پالیسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول پر استوار کرتا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد

ہمیں اس بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس دنیا میں صرف مادی اسباب و وسائل ہی کارفرما نہیں ہیں۔ یہ دُنیا اخلاقی قوانین کے بھی تابع ہے۔ انسان نے بارہا مادی ترقی کی بلندیوں کو حاصل کیا ہے، لیکن اخلاقی ضوابط سے بغاوت کی وجہ سے وہ اپنی مادی ترقی کو قائم نہ رکھ سکا۔

سلطنت روما اور سلطنتِ فارس کے پاس کس چیز کی کمی تھی، لیکن وہ تباہی سے بچ نہ سکیں۔ تمام تہذیبیں جو آج تک اُبھری اور تباہ ہوئی ہیں، اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ مادی قوانین کے ساتھ ساتھ زندگی میں کچھ اخلاقی قوانین بھی کارفرما ہیں اور ان کو نظرانداز کرکے کوئی قوم حقیقی ترقی حاصل نہیں کرسکتی۔ اسلامی نظریہ، ترقی کے مادی اور معاشی قوانین کے ساتھ ساتھ اخلاقی قوانین کی ترقی کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اس طرح ایک متوازن اور مبنی برعدل تہذیب کے فروغ کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ دوسرے تمام نظام ہائے زندگی اس تعلق کو نظرانداز کردیتے ہیں اور اسی لیے ناکام ہیں۔ مادی اور اخلاقی زندگی کے گہرے تعلق کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

- کسی قوم میں جب بدکاری پھیل کر عام ہوجائے اور وہ اسے کھلم کھلا کرنے لگے تو ایسی قوم طاعون اور دوسری بیماریوں کی مصیبت میں گرفتار ہوگی اور ایسے دُکھ درد سے دوچار ہوگی جس سے اس کے اسلاف ناآشنا تھے۔
- اور جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرے گی تو وہ قحط سالی اور حکمرانوں کے ظلم و جور کا

شکار ہوگی۔

- اور جب کوئی قوم زکوٰۃ دینا بند کردے گی تو اس پر بارش (خدا کی چھت) بند ہوجائے گی اور اگر ہوگی بھی تو (انسانوں کی وجہ سے نہیں) بلکہ دوسرے حیوانوں کی وجہ سے۔
- جب کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد و پیمان توڑ دے گی، تو اللہ تعالیٰ ان پر ان کے دشمن کو مسلط کردے گا، جو ان کے قبضے کی بعض چیزیں چھین لے گا۔
- اور جب ان کے ائمہ اور قائدین کتاب اللہ پر فیصلے کرنا ترک کردیں گے اور اپنی مرضی کے احکام اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان لڑائی جھگڑے پیدا فرما دے گا۔ [ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب العقوبات، حدیث: ۴۰۱۷]

اس طرح پہلے خلیفۂ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں فرمایا تھا:

- اے لوگو! جس قوم نے بھی اللہ کے راستے میں جہاد کرنا چھوڑ دیا، اللہ نے اسے ذلیل کیا اور جس قوم میں بھی بدکاری پھیل جائے، تو اللہ اس میں مصیبت کو بھی پھیلا دیتا ہے۔ [سیرت ابن ہشام، ج ۴، ص ۳۱۲، دارالکتاب، العربی، بیروت]

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظریے کا قیام خود ہماری مادی اور قومی زندگی کے تحفظ کے لیے بھی ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ ہم اپنے مسائل کو حل کرسکتے ہیں اور نہ اپنی تعمیرِنو کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرسکتے ہیں۔

آج دُنیا میں جو کش مکش برپا ہے، اس سے بھی یہ سبق ملتا ہے کہ اب مقابلہ محض چند افراد، کچھ قوموں اور بعض ملکوں میں نہیں بلکہ دراصل مقابلہ 'الٰہی ہدایت' سے رہنمائی و طاعت اور ہدایتِ الٰہی سے بغاوت و طاغوت کی پیروی کے درمیان ہے۔ مغرب کے پاس کوئی مثبت آئیڈیالوجی نہیں ہے، اور وہ جمہوریت، سیکولرزم، لبرلزم، آزادیٔ حقوقِ انسانی اور تحفظ فرد کے نعروں سے اپنا کام نکالنے کی ناکام کوشش کررہا ہے۔ ہمارے عہد میں مسلط عالمی سامراج، مادہ پرست تہذیب کی پیداوار ہے اور ہم مغرب کی نقالی کرکے فائدے میں نہیں خسارے میں ہیں۔ ہمارے پاس اسلام کی صورت میں ایسا عادلانہ نظریہ ہے، جس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ہم خود سیکولر فسطائیت کا مقابلہ کرسکتے ہیں بلکہ باقی دنیا کو بھی ایک نئی راہ دکھا سکتے ہیں لیکن افسوس ؎

کرسکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

مسلمانوں پر مسلط کردہ موجودہ سیاسی وتہذیبی جنگ اور جدید مالی کش مکش پر نگاہ رکھنے والے افراد اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہم اگر دُنیا کی سیاست میں کوئی تاریخی کردار ادا کرسکتے ہیں تو وہ نقالی کرکے نہیں کرسکتے بلکہ اس صورت میں کرسکتے ہیں کہ جب ہم اسلام کے عادلانہ نظریے کو بالفعل قائم کریں اور اسے دوسروں کے لیے مثال بنادیں۔ نقالی کرکے ہم شاگرد بن سکتے ہیں، بہت سے بہت شاگردِ رشید بن سکتے ہیں، لیکن کوئی تخلیقی اور قائدانہ کارنامہ اسی وقت انجام دے سکتے ہیں کہ جب تک ہم خود ایک عالمی آئیڈیالوجی کے علَم بردار نہ بنیں۔

خدا سے عہد شکنی کا نتیجہ

پھر سب سے بڑھ کر دُنیاوی اور ملکی مفاد سے ہٹ کر ایک پہلو اور بھی قابلِ غور ہے۔

ہم نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے موقعے پر اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ ''اے مالک، تو ہمیں کامیابی عطا کر اور ہم تیری زمین پر تیری نازل کردہ ہدایت قائم کریں گے''۔ کیا اس نظریے کو ترک یا نظرانداز کرنے کے معنی خدا کے غضب کو دعوت دینے کے نہ ہوں گے؟ ہم اپنے آپ کو خدا کی عنایت اور اِکرام کا اسی وقت مستحق بناسکتے ہیں، جب ہم اس مقصد اور اس وعدے پر قائم رہیں، جو ہم نے زمین و آسمان کے مالک و خالق سے کیا تھا۔ اگر ہم اپنے اس عہد کو توڑ دیتے ہیں تو لازماً ہم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں سے بھی محروم کرلیں گے۔ اور اس سے زیادہ بدبخت کون ہوگا جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم کرلے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ (انفال ۸:۵۳) یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو دی ہے، اس وقت تک بدلنے والا نہیں جب تک وہ خود اپنے کو نہ بدل لے [یعنی اپنے اعتقاد اور اپنے مقاصد سے منحرف نہ ہوجائے]۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ:

يَا مَعشَرَ قُرَيْشٍ ، فَإِنَّكُمْ أَهْلُ هٰذَا الأَمْرِ، مَا لَمْ تَعْصُوا اللهَ فَإِذَا عَصَيْتُمُوْهُ بَعَثَ عَلَيْكُمْ مَن يَلْحَاكُمْ ، كَمَا يُلْحَى هٰذَا القَضِيْبُ لِقَضِيبٍ فِي يَدِهٖ ثُمَّ لَحَا قَضِيبَهٗ [مسند احمد، من مسند بنی ہاشم، مسند عبداللہ بن مسعودؓ، حدیث:۴۲۳۱]

اے اہلِ قریش تم اس وقت تک لطف و کرم کے مستحق رہو گے، جب تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو گے اور جب تم گناہ کی زندگی پر اُتر آؤ گے، تو وہ تم پر ان لوگوں کو بھیجے گا، جو تمھاری کھال ادھیڑ ڈالیں گے جیسے اس شاخ کی چھال چھیل دی جاتی ہے۔ آپؐ کے دست مبارک میں ایک شاخ تھی، جسے آپؐ نے چھیل کر بتایا۔

اور قرآنِ پاک کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ براہِ راست ہم ہی سے خطاب ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (انفال ۸:۲۶) اور وہ وقت یاد کرو جب تمھاری تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو اُچک نہ لیں۔ پھر اللہ نے تمھیں ٹھکانا دیا، اپنی مددگاری سے قوت بخشی، اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا تاکہ تم شکرگزار بنو۔

شکرگزاری کا راستہ، اللہ کے دین کو اختیار کرنے اور اسلامی نظریے کو قائم کرنے میں ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو سخت ناشکرے ہوں گے اور اللہ کے عذاب کو دعوت دیں گے۔ اس لیے ہمارے لیے سیدھا راستہ یہی ہے کہ ہم اسلامی نظریے، اسلامی تہذیب و معاشرت اور اسلامی معاشی نظامِ عدل کو خلوص اور ایمان داری کے ساتھ اختیار کریں اور اس کے دیے ہوئے پروگرام پر عمل کریں۔

دو غلط نقطہ ہائے نظر

اسلامی نظریے کی تنفیذ کے سلسلے میں دو نقطہ ہائے نظر کے جائزے کی ضرورت ہے:

ایک نظریہ تو یہ ہے کہ ''اصل چیز پروگرام ہے، نام نہیں، اس لیے اسلام کا نام لیے بغیر ہی اس کے اصلاحی پروگرام پر عمل کرنا چاہیے''۔

دوسرا نقطۂ نظر متجددین کا ہے جو اسلام کا نام تو برقرار رکھتے ہیں، لیکن 'تعبیرات' کے

ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے سے ان اسلامی اصطلاحات کے معنی بدل دیتے ہیں، اور اسلام کے نام کی پرانی بوتلوں میں جدید مغربی فکر وتمدن کا زہر بھر دیتے ہیں۔

ہم ان دونوں نقطۂ ہائے نظر کو غلط سمجھتے ہیں اور نظریۂ پاکستان کے منافی قرار دیتے ہیں۔

اسلام کا نام لینے سے گریز

● اوّل الذکر کے سلسلے میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ آخر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ 'اسلام کا نام نہ لیا جائے'؟ درحقیقت اس کا اصل محرک واقعاتی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے۔ یہ ایک قسم کے چھپے ہوئے احساسِ کمتری کی پیداوار ہے اور ہرگز ہمت افزائی کے لائق نہیں ہے۔ جو لوگ اسلام پر فخر محسوس کرنے کے بجائے شرمندگی محسوس کرتے ہیں، وہی بالعموم اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسلام کے نام کو جان بوجھ کر استعمال نہ کریں اور پھر جو لوگ اسلام کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں وہ اس کے پروگرام پر کیا عمل کریں گے؟

● دوسری چیز یہ ہے کہ نام کی خود اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ وہ ایک زائد از ضرورت شے نہیں ہے۔ دراصل نام کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت، اس کے اصل آئیڈیل اور منزل کو متعین کیا جاتا ہے۔ پھر نام کے ذریعے اس اصل مقصود کی مسلسل تذکیر بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح اصل مقصد کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو پاتا۔ ایک مسلمان بچے کو سب سے پہلے مسلمانوں کا سا نام اسی لیے دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو جان لے، اور اس میں بھی اچھے سے اچھا نام اس لیے دیا جاتا ہے کہ اس نام سے جو شخصیات اور جو تصورات وابستہ ہیں، وہ ان کو اپنا آئیڈیل اور مقصود بنالے۔

نام اصل شے سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اس کی حقیقت کا اظہار ہے اور یہی تصور قرآن کریم سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ تخلیق انسان کے بعد سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ آدمؑ کو اشیا کے نام بتائے گئے (عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا) یعنی ان کی حقیقت سے آدمؑ کو مطلع کیا گیا۔ نام کا اصل شے سے ہٹ کر کوئی وجود نہیں اور اصل شے کا نام کے بغیر کوئی اثر نہیں!

● تیسرے یہ کہ اسلام میں نام کی بڑی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اسلام اپنے پورے پروگرام کو کفر کے پروگرام سے ممتاز کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے جداگانہ تشخص اور مزاج کا اظہار منجملہ اور چیزوں کے، جداگانہ نام سے بھی ہوتا ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس سے

منع فرمایا ہے کہ وہ کفّار کے ساتھ ظاہری مشابہت بھی پیدا کریں: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ اس حکم میں نام کا مسئلہ بھی آتا ہے اور اس کی روشنی میں ہمیں اپنا علیحدہ تشخص ضرور ظاہر کرنا چاہیے، تاکہ ہمارے طریقے اور اہلِ کفر کے طریقے کا فرق نمایاں ہوسکے۔

● پھر مسلمانوں کو ترغیب دینے ان میں عمل اور قربانی کے جذبات بیدار کرنے، ان میں تحریک وحرکت رُونما کرنے اور جدوجہد کا ولولہ اور شوق پیدا کرنے کے لیے اسلام کا نام بے حد ضروری ہے۔ 'جہاد' کے لیے جو جذبہ مسلمانوں میں پیدا ہوگا وہ کبھی محض جنگ کے لیے نہیں ہوگا بلکہ جہاد کی تمام علمی، قلمی، دعوتی شکلوں کو بھی ساتھ لے کر چلنے کا کلچر بھی ہوگا۔ زکوٰۃ اور انفاق کے لیے جو جذبہ وشوق رُونما ہوگا، وہ صرف محصول اکٹھا کرنے کے لیے نہیں ہوسکتا۔

'عبادت' کے لیے جو ولولہ ہوگا وہ ورزش کے لیے نہیں ہوسکتا۔ 'شہادتِ حق' کے لیے جو قربانی وہ دیں گے، وہ پروپیگنڈے کے لیے نہیں ہوسکتی۔ اس لیے عملی نقطۂ نظر سے بھی نام کی بڑی اہمیت ہے۔

● نیز ہم اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتے کہ اپنے کام میں برکت پیدا کرنے اور اللہ کی مدد واستعانت طلب کرنے کے لیے بھی لازم ہے کہ ہم اسلام کا اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام لیں۔ اس کے بغیر ہم اُس برکت کے مستحق نہیں ہوسکتے، جس کے بغیر ہماری ساری مساعی بیکار ہیں۔

● اور پھر جب قرآن کریم ہمیں اصل کام کے ساتھ ساتھ نام کے اظہار کا بھی صاف صاف حکم دیتا ہے تو ہم اس سے رُوگردانی کرنے والے کون ہیں؟ اسلام کی مصلحتوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے زیادہ تو ہم نہیں جانتے۔ جب وہ خود ہمیں 'مسلم' کا نام دیتے ہیں اور اس کے اظہار کا بھی حکم دیتے ہیں تو ہم اس نام کی 'شدھی' کرنے والے کون ہیں؟ قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝۳۳
(حم السجدہ ۴۱:۳۳) اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ مَیں مسلمان ہوں۔

یہاں صاف ارشادِ ربانی ہے کہ ''اللہ کی طرف بلائے'' اور کہے کہ ''میں مسلمان ہوں''۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے پروگرام کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کا نام بھی لیا جائے۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جس طرح اصل پروگرام کو چھوڑ کر صرف 'نام' پر

انحصار کرنا غلط اور اسلام کے منشا کے خلاف ہے، اسی طرح نام کے بغیر پروگرام کو پیش کرنا بھی اس کی تعلیمات کے منافی ہے۔ 'نام' اور 'پروگرام' دونوں کو ساتھ ساتھ ہونا چاہیے اور یہی راہِ صواب ہے۔

اجتہاد کے نام پر مغربی اقدار کا فروغ

جہاں ایک گروہ نام پر معترض ہے وہاں ایک دوسرا گروہ ہے، جو نام کو باقی رکھ کر معنی بدل دینا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ ''جدید مغربی تہذیب نے جو بھی اقدار (values) دی ہیں اور تہذیب وتمدن کا جو بھی ڈھنگ بنایا ہے، اسے اسلام سے درست ثابت کردے''۔ اسلام کی اصطلاحات کو اور اس کے الفاظ کو تو باقی رکھے، لیکن 'معنوی تحریف' (falsification) کے ذریعے اللہ کے دین کو مغرب کا چربہ بنادے۔ اگر مغرب میں سود جائز ہے تو یہ اسلام میں بھی سود کے لیے جواز نکال لیتے ہیں۔ اگر مغرب میں موسیقی اور مجسمہ سازی، کلچر کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں، تو ہمارے مجتہدین بھی انھیں اسلامی ثقافت کی عین 'روح' ثابت کرتے ہیں۔ اگر مغرب 'حجاب' اور 'تعدداَزدواج' کو غلط سمجھتا ہے تو یہ 'دانش ور' باادب عرض کرتے ہیں کہ 'بھلا ان چیزوں کا اسلام سے کیا تعلق؟ یہ سب مُلّا کی ایجادات ہیں'۔ اگر مغرب، اسلام پر تشدد کی پھبتی کستا ہے تو یہ جہاد کو یک سر منسوخ کردیتے ہیں۔ اگر مغرب نماز، روزہ اور قربانی کو لغو سمجھتا ہے تو یہ بزعمِ خود اسلامی نقطۂ نظر سے بھی ان کی 'لغویت' بیان فرماتے ہیں۔ اور یہ سارا کارنامہ 'اجتہاد' کے نام پر اسلام کی 'تعبیرِ نو اور تشکیلِ نو' کے ہاتھوں ہورہا ہے۔ اگر پہلا فساد 'نام نہ استعمال کرنا' تھا، تو یہ فساد 'فتنۂ تعبیر' کے ذریعے ہے۔

ان حضرات نے اس بات کو تو محسوس کرلیا ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کے نام کے بغیر عمل پر نہیں اُکسایا جاسکتا اور جب تک کسی چیز پر اسلام کا لیبل نہ ہو مسلمان اسے کبھی قبول نہیں کرسکتے۔ لیکن وہ اس کو بھول گئے ہیں کہ اسلام محض ایک خالی خولی نظریہ نہیں ہے کہ وہ جس طرح چاہیں، اسے مسخ کریں اور جو شکل چاہیں اسے دے دیں۔ اسلامی نظریے کو خود خدا کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کے میدان میں قائم کیا تھا اور اسلامی تہذیب ومعاشرت کے آثار گذشتہ چودہ سو برسوں سے اس سرزمین پر قائم ہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی کی حیثیت کوئی ایک کتابی شے کی سی نہیں، ایک عملی حقیقت کے طور پر ہے۔ تواتر کے ساتھ اس پر عمل ہورہا ہے اور جن معاملات میں عمل نہیں ہورہا، وہاں بھی اسلامی اقدار موجود اور محفوظ ہیں۔ مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات، علمی اور عملی دونوں طریقوں سے پہنچی ہیں۔

اسلام کوئی معما نہیں ہے۔ اسلام تو ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے اور اسے مسخ کرنا آسان کام نہیں ہے۔

یورپ میں عیسائی پادریوں نے یہ کام ضرور کیا تھا کہ جب چاہا، مسیحیت کی من مانی تعبیر کردی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ وہاں خدا کی اصل ہدایت محفوظ تھی، نہ وہ زبان محفوظ تھی کہ جس میں خدا کی ہدایت نازل ہوئی تھی۔ اور نہ کوئی زندہ روایت موجود تھی، جو اس ہدایت کی عملی شکل پیش کرتی ہو۔ لیکن جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے تو ان میں سے کوئی ایک کڑی بھی ٹوٹی ہوئی نہیں ہے۔

یہاں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت پوری طرح محفوظ ہیں۔ ان میں 'سرِمُو' بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ قرآن اور سنت کی زبان ایک زندہ زبان ہے، جس کے الفاظ و معانی متعین ہیں اور من مانی تاویلات کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اسلامی لٹریچر کا ایک عظیم خزانہ موجود ہے، جس میں ہر ہر دور کا فکری و عملی سرمایہ محفوظ ہے۔ ایک معاشرہ اس نظریے پر قائم ہے اور پورے تسلسل کے ساتھ گذشتہ چودہ سو سالوں سے وہ اس پر عامل ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں 'تعبیر کے فتنے' کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ اپنے تمام جہل، کج روی، کم علمی اور کوتاہ عملی کے باوجود آج بھی مسلمانوں کا بچہ بچہ بتا سکتا ہے کہ نماز اور روزہ فرض ہیں۔ قربانی ضروری ہے، زکوٰۃ لازم ہے، بے حیائی منع اور حجاب و ستر پوشی لازم ہے، سود حرام ہے، مجسمہ سازی ناجائز ہے، موسیقی ناپسندیدہ ہے۔ اسلام کوئی 'کتابِ گم شدہ' نہیں کہ آپ اپنی پٹاری سے جو چاہیں نکال لیں اور اسلام کے نام پر پیش کردیں۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب ہے اور ہر تحریف کا پردہ پہلے قدم پر ہی چاک ہوجائے گا، اور ان شاءاللہ ہماری سوسائٹی میں 'فتنۂ تعبیر' کے کھوٹے سکّے نہ چل سکیں گے۔

پھر اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود فتنۂ تعبیر و تحریف کو ملّت اسلامیہ کے ضمیر نے کبھی قبول نہیں کیا۔ آج سے پہلے 'معتزلہ' نے یہی کام کیا تھا، لیکن ملت اسلامیہ نے اس گروہ کو اس طرح فراموش کردیا کہ دنیا اس کے نام تک کو بھول گئی۔ سرسید احمد خاں مرحوم کی قومی خدمات اپنی جگہ، لیکن انھوں نے بے جا طور پر دینی اُمور اور افکار میں تحریف یا من مانی تعبیر کی کوشش کی تھی مگر ملّت میں ایک دن کے لیے بھی ان کے مذہبی نظریات جگہ نہ بنا سکے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ مسلم سوسائٹی میں بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں رہی ہیں، اور آج بھی موجود ہیں، لیکن آج تک اس نے اپنے آئیڈیل کو نہیں بدلا اور نہ کسی کو بدلنے دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فتنۂ تجدد نے بارہا سر اُٹھایا لیکن ہمیشہ ناکام رہا۔ کبھی یہ 'اعتزال' کی شکل میں رونما ہوا، کبھی 'باطنیت' کے رُوپ میں، کبھی دین اکبر کی صورت میں نمودار ہوا تو کبھی نیچریت کے پیکر میں۔ کبھی پہلوی ازم بنا، کبھی کمال ازم اور انکارِ سنت و انکارِ ختم نبوت کے رُوپ میں۔ لیکن ہمیشہ ایمان، دلیل اور اجتماعی ضمیر کی قوت سے ایسے فتنوں کا سر کچل دیا گیا۔ آج بھی ملت کا ضمیر ایسی کسی حرکت کو قبول نہیں کرسکتا۔

پروفیسر ولفریڈ کینٹ ول اسمتھ نے اس رجحان پر 'فکرمندی' کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

> یہ ایک ہمہ گیر حقیقت ہے کہ گذشتہ ربع صدی میں اسلام میں لبرلزم کا رجحان بڑی نمایاں حد تک کم ہوگیا ہے بلکہ بعض علاقوں کے متعلق تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بالکل ہی غائب ہوگیا ہے۔

استحکام کے بجائے انتشار کا خدشہ

جو کچھ ہم نے اُوپر عرض کیا اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس نوعیت کی تعبیرات اور تشریحات کبھی مسلمانوں میں جذبۂ عمل اور ذوقِ قربانی پیدا نہیں کرسکتیں۔ اگر آدمی اخلاص کے ساتھ اسلام کا ہوجائے تو بڑے سے بڑا کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔ اور اگر اخلاص کے ساتھ بالکل مغرب کا ہوجائے تو بھی کم از کم مغربیت کے اتباع میں تو ممکن ہے کچھ جوش دکھا سکتا ہے، لیکن آدھے تیتر اور آدھے بٹیر والی پالیسی کبھی بھی عملاً کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس کے نتیجے میں زندگی سے فرار تو رُونما ہوسکتا ہے، اسلامی تہذیبی روایت سے انحراف بھی واقع ہوسکتا ہے، لیکن زندگی کی تعمیر و تشکیل کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ہم خدانخواستہ کسی ایسے فتنے کا شکار ہوجاتے ہیں تو پھر یہ احمقانہ رویہ پوری قوم کو جذبۂ عمل سے محروم کردے گا۔

اسی طرح ہمارے ہاں وقتاً فوقتاً پیدا ہونے یا پروان چڑھائے جانے والے متجددین کی ان کوششوں سے قوم میں فکری ژولیدگی پیدا ہورہی ہے۔ ایسے لوگ مسلمانوں کی اب تک کی روایات کو منہدم کررہے ہیں، جس سے ایک طرف تو 'جدید' اور 'قدیم' کی کش مکش پیدا ہورہی ہے اور دوسری طرف قوم میں ذہنی انتشار فروغ پارہا ہے اور جس قوم میں ذہنی انتشار ہو، وہ کبھی اچھا دفترِ عمل پیش نہیں کرسکتی۔

ماضی سے اندھی بہری بغاوت کا رجحان خود اپنے اندر بڑے مفسدات رکھتا ہے۔ ہماری ترقی اسی وقت ممکن ہے، جب ہم اپنے تاریخی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اگر ہم نے وہ سب کچھ دریابرد کرنے کی کوشش کی، جو آج تک مسلمانوں نے حاصل کیا ہے تو ہماری قوتیں ایک اندرونی کش مکش کی نذر ہوجائیں گی اور مجموعی طور پر قوم کو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ 'تجدد' کا فتنہ ملک کے لیے ایک عظیم خطرہ ہے اور اس کی ہر کوشش نظریۂ پاکستان کی بنیادوں پر ایک ضربِ کاری ہے۔

تعمیرِ ملّت کی اساس

ہماری نگاہ میں مذکورہ بالا دونوں راستے گمراہی کے راستے ہیں۔ سیدھی راہ یہ ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی پر اس کے اصل رنگ میں عمل ہو اور آزادی کے ہر پہلو پر اس کی حکمرانی قائم ہو۔

اس کے لیے ایسا پروگرام بنانا ہوگا، جو ایک طرف فرد کی اصلاح کرے اور اس میں حقیقی ایمان پیدا کرے۔ اللہ کے خوف سے اس کے دل کو معمور کرے اور عمل صالح کی راہ پر اسے گامزن کردے اور دوسری طرف اجتماعی زندگی کی اصلاح اور تشکیل نو کا کام انجام دے۔ جب تک ان دونوں محاذوں پر بیک وقت کام نہ ہوگا، نظریۂ پاکستان کو اپنی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی نہیں کیا جاسکے گا۔ یہ کام کسی ایک فرد، ادارے، جماعت یا صرف حکومت کے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ سب کا کام ہے اور پوری اُمت کی ذمہ داری ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ [صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المرأۃ، راعیۃ فی بیت زوجھا، حدیث: ۴۹۰۸] تم میں سے سب کے سب نگران ہیں اور تم میں سے ہر ایک سے اپنی اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

یہ ذمہ داری ہر فرد کی ہے، ہر ادارے اور جماعت کی ہے اور سب سے بڑھ کر حکومت کی ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اس نظریے کو قائم کرے۔ ہر ایک کو سب سے پہلے، اسے اپنے اُوپر قائم کرنا چاہیے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اسے دوسروں پر اور پورے نظامِ زندگی پر نافذ کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط (الرعد ۱۳:۱۱) اللہ تعالیٰ کسی

قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہیں بدلتی۔

اصلاح اور تعمیرِ نو کی ذمہ داری، پوری قوم کی ذمہ داری ہے۔ ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس نظریے کا پرچار کرے اور جس دائرے میں بھی اسے اختیار حاصل ہے، اس میں اسے قائم کرے۔ ہر ادارے اور جماعت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی علَم بردار بنے اور اپنے دائرۂ اختیار میں اسے نافذ کرے۔ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی داعی بنے اور ملک کی معاشی، معاشرتی، سیاسی، اخلاقی، قانونی اور بین الاقوامی پالیسی کو اس کی روشنی میں مرتب کرے، تاکہ یہ نظریہ زندگی کے ہر شعبے میں جلوہ گر ہو اور اس طرح پاکستان اپنی اصل منزل کی طرف گامزن ہو سکے۔

ملک کو درپیش مسائل

پاکستان کے نظریاتی پہلو پر زور دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ روزمرہ زندگی اور ریاست میں پیدا ہونے والے سماجی و معاشی چیلنجوں کا جواب نہ دیا جائے۔ آج وطن عزیز درج ذیل حوالوں سے دہکتے انگاروں کا منظر پیش کر رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ:

۱- پاکستان عمومی طور پر شدید نوعیت کی معاشی مشکلات، تضادات اور تصادمات کی زد میں ہے۔ جس کا بنیادی سبب معاشی بدانتظامی، سودی معیشت پر اصرار اور ناپائدار معاشی پالیسیاں ہیں۔

۲- قومی بجٹ اور ریاست کی جانب سے اپنے شہریوں کے ساتھ سالانہ عہد و پیمان (بجٹ) کے بجائے، عملاً سال کے دوران چار، پانچ بجٹ لانے کی شرانگیزی ہے۔ پہلے ہر یکم تاریخ کو تیل کی قیمتوں میں اضافہ کیا جاتا تھا اور اب ہر ماہ کی یکم اور ۱۵ تاریخ کو بھی قیمتوں میں ردوبدل کر کے سارے معاشی منظرنامے کو بدترین صورتِ حال سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہر فرد، کارپوریشن اور ادارہ معاشی منصوبہ تیار کرنے کی صلاحیت اور اختیار کھو بیٹھا ہے۔ ایسی معاشی بدانتظامی کا یہ اثر ہے کہ افراطِ زر، مہنگائی اور حد سے بڑھتی ہوئی طبقاتی تفریق کا پہاڑ کھڑا ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے اس ریاستی اداراتی بے راہ روی کے منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کے لیے نہ سیاسی پارٹیاں تیار ہیں اور نہ دُور دُور تک اعلیٰ تعلیمی ادارے، دانش وَر اور تجزیہ کار بند باندھنے کے لیے آمادہ کار ہیں۔

۳- اس معاشی اور طبقاتی فساد نے سماجی فاصلے گہرے کر دیے ہیں۔ شہریوں میں جسمانی بیماریاں تو ایک طرف رہیں، ذہنی بیماریوں کا نہ ختم ہونے والا جنگل بڑھتا جارہا ہے۔ ہرسال خودکشی کے بڑھتے ہوئے واقعات، طلاق اور خلع کی تعداد میں ناقابلِ تصور اضافے کا رجحان، بات بات پر لوگوں کا توڑ پھوڑ پر آمادہ ہوجانا (جس کی ایک مثال تو وکیلوں کی جانب سے معزز ججوں پر حملے، پولیس اور ڈاکٹروں پر تشدد وغیرہ کی صورت میں بھی سامنے آتی رہتی ہے) اور اس نوعیت کے مریضانہ رویے، جنگل کے معاشرے کی یاد دلاتے ہیں۔

۴- پولیس کے نظام کی بدانتظامی اور عدالتی عمل کے غیرمؤثر ہونے کی کیفیت نے لوگوں کو عدم تحفظ، خوف اور مایوسی سے دوچار کیا ہے۔

۵- زراعت کے پیشے میں سہولیات کی فراہمی کے نظام کی بدنظمی، اور زراعت کے بارے میں ریاستی مشینری کی کم فہمی اور کسانوں کے معاملات کو سمجھنے اور ان کے بالکل جائز مسائل حل کرنے سے لاتعلقی نے زراعت وخوراک جیسی بنیادی صنعت کو شدید دھچکا پہنچایا ہے۔

۶- صنعت وحرفت اور درآمد و برآمد تجارت کے معاملات میں غیرمتوازن رویوں نے لوگوں کو سرمایہ کاری سے ہٹا کر، بیرونِ ملک جائدادوں کی خریداری کی طرف دھکیل دیا ہے، یا پھر دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کی راہ دکھائی ہے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان میں بے روزگاری کو فروغ ملا۔ اس صورتِ حال میں جرائم میں اضافہ فطری بات ہے۔

۷- دوسری طرف کثیرقومی کمپنیوں کے لیے سرخ قالین بچھا کر استقبال کرنے کا اور انھیں من مانی کرنے کی کھلی اجازت دینے کا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ اہلِ حل وعقد (نوکرشاہی اور سیاسی قیادت) کے گٹھ جوڑ کو ملک اور ملک کے شہریوں کے مفادات سے کوئی سروکار نہیں۔ ٹیلی کمیونی کیشن کمپنیوں اور ادویات ساز کمپنیوں کی مثالیں اس معاملے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

۸- اور سب سے زیادہ لرزا دینے والا معاملہ تعلیم کی فروخت سے منسوب کاروبار ہے۔ بچوں کو معیاری تعلیم نہیں مل رہی، لیکن تعلیمی تاجر دونوں ہاتھوں سے، پسے ہوئے غریب شہریوں کو لُوٹ رہے ہیں۔ درس گاہیں علم کی شمع روشن کرنے کے بجائے فیشن پریڈ کے مراکز میں تبدیل ہورہی ہیں۔ روزافزوں اخلاقی بے راہ روی الگ مسئلہ ہے، اور دی جانے والی

تعلیم کے معیار کو جانچنے کا سوال اس سے بھی زیادہ الم ناک کیفیت سامنے لاتا ہے۔ یکساں نظامِ تعلیم کے نام پر قومی تعلیمی پالیسی میں غیر منطقی اور متصادم تبدیلیوں کا ڈراما مضحکہ خیز منظر دکھاتا ہے۔ سرکاری تعلیمی شعبہ زبوں حالی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ سرکاری شعبۂ تعلیم کی اس بدانتظامی نے نجی شعبے کو من مانی کرنے کا کھلا لائسنس عطا کر دیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس موضوع کو کوئی زیر بحث لاتا ہی نہیں۔ نہ پارلیمنٹ، نہ میڈیا، نہ سیاست دان اور نہ اخبارات۔

۹- مختلف آئینی اداروں کا ایک دوسرے کے معاملات اور منصبی ذمہ داریوں میں بے جا مداخلت کرنا بلکہ زور زبردستی کرنا، ایسا بدنُما طرزِعمل ہے، جس نے ریاستی انتظامی توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

۱۰- معاشرے کی تعمیر حددرجہ بنیادی فریضہ ہے۔ عصرحاضر نے معاشرتی تعمیر کا کم وبیش خاصا حصّہ ذرائع ابلاغ کے سپرد کر دیا ہے، جو دل، دماغ، مشاہدے اور تعلقات کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ وطن عزیز کے بیش تر ذرائع ابلاغ، اس حوالے سے مایوس کن تصویر پیش کرتے ہیں۔ مایوسی، تصادم، مبالغہ، گاہے تاریخی عوامل کی جھوٹی منظرکشی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کی بہت سی مثالیں ہمارے ذرائع ابلاغ پیش کر رہے ہیں۔

۱۱- سب سے نازک معاملہ یہ ہے کہ مسئلۂ کشمیر پر قومی یکسوئی کو متاثر کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ایسے شوشے چھوڑے جاتے ہیں، جن سے پوری جدوجہد کو شدید صدمہ پہنچتا ہے۔ پھر محکمہ خارجہ اور پارلیمنٹ کی جانب سے قرارواقعی توجہ نہ دینا، مسئلۂ کشمیر کی ماہیت پر شدید منفی اثر ڈالنے کا سبب بن رہا ہے۔

نظریاتی حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے، اُوپر مذکورہ جن گیارہ نکات کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، انھیں درست کرنا کسی بین الاقوامی ادارے کی نہیں خود ہمارے اہل حل وعقد کی ذمہ داری ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے بااثر لوگ یہ ذمہ داری ادا کرنے کے لیے اپنا حصّہ ادا کرنے سے حددرجہ غافل دکھائی دیتے ہیں۔ اگر انھوں نے یوں ہی فرار کی راہ اختیار کیے رکھی تو ملک وملّت کو شدید نقصان پہنچے گا اور آیندہ نسلیں اُنھیں معاف نہیں کریں گی۔

ہر عہد کی ضرورت!

اسلام بحیثیت مذہب ایسے جامع اور ہمہ گیر قوانین اور اصولوں سے عبارت ہے کہ انسانی زندگی اپنی تمام بوقلمونیوں اور وسعتوں کے ساتھ ان کے دائرے میں جلوہ گر نظر آتی ہے، اور اس کا کوئی گوشہ خواہ وہ جذبات کی دُنیا سے متعلق ہو، یا خیالات، افعال، عبادات، معاشی معاملات، معاشرتی تعلقات، جبلّی محرکات اور روحانی تحریکات سے، اس کی گرفت سے آزاد نہیں رہتا۔ ان مختلف النوع پہلوؤں میں مطابقت پیدا کر کے اسلام انھیں ایک حسین متناسب اور منفرد نظامِ حیات کی صورت بخشتا ہے۔

کیا ایسا ہمہ گیر، متناسب اور منفرد نظامِ حیات کسی زمانے میں بھی اپنی افادیت کھوسکتا ہے؟ کیا انسان واقعی اس سے بے نیاز ہوسکتا ہے؟ یقیناً یہ نظامِ زندگی کبھی فرسودگی کا شکار نہیں ہوسکتا، نہ اس سے انسان بے نیاز رہ سکتا ہے۔ کیونکہ اپنے مقاصد اور نصب العین کے لحاظ سے یہ خود زندگی کے ہم معنی ہے، بلکہ خود زندگی ہے۔ چنانچہ جب تک اس کرۂ ارض پر زندگی پائی جائے گی، یہ نظام بھی موجود اور باقی رہے گا اور یہ نقش کبھی مٹایا نہ جاسکے گا!

محمد قطب

(اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ترجمہ: محمد سلیم کیانی)

عطیۂ اشتہار: صوفی بابا